

مولانا یاسر احمد زریک *

امام بخاریؒ کے تعلیمی نظریات سے قدیم و جدید ماہرین تعلیم کا اتفاق (حصہ اول)

علم کا حصول اگرچہ مسلسل عمل اور نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے یعنی مہد سے لحد تک۔ اس لیے اہل علم کی ایک اہم اور بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ حاصل شدہ علم کو اپنے تلامذہ، آنے والی نسلوں اور اس علم کے متلاشیوں کو دیانت داری کے ساتھ بہترین طریقے سے منتقل کریں۔ مجموعی طور پر علوم اسی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ جہاں اس فرض میں کوتاہی ہوتی ہے اور جس دور میں اجتماعی طور پر اس بنیادی کام سے پہلو تہی کی جاتی ہے، وہ جگہ اور دور تاریکیوں میں ڈوبنے لگتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ عظیم الشان و خیرہ علوم و فنون اور عظمت تہذیب و تمدن کے بانی و محسن و ہی بے لوث اور پُر خلوص مشعل بردار تھے جنہوں نے اپنے علم و تجربے کو آگے منتقل کیا۔ بے شک جاننے والے نہ جاننے والوں پر فوقیت رکھتے ہیں لیکن اس جاننے کے عمل کو جاری رکھنے اور شعور و آگہی کی دولت کو منتقل کرنے میں جن کا خون پسینہ ایک ہوتا ہے اور جن کی راتوں کی نیندیں اور دنوں کا چمن اس مقدس فریضہ کی نظر ہو جاتا ہے، اُن کی شان ہی کچھ اور ہے۔ وہی لوگ یقیناً معلمین ہیں، جو انسانیت کے محسن، حال کے رہبر اور ماضی کے درخشاں روایات کے امین ہوتے ہیں۔ انہیں زندگی میں مادی اور اخلاقی اجر ملے نہ ملے لیکن اُن کی روشن مشعلیں انسانی راہوں کو منور کرتی رہتی ہیں اور یوں اُن کا نام لوحِ حیات پر نقش دوام بن جاتا ہے۔ ماضی کے ان درخشاں مشطوں اور لوحِ حیات پر نقش دوام بننے والی ایک شخصیت امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ کی بھی ہے جنہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”المجامع الصحیح للبخاری“ میں کتاب العلم کے تحت احادیث مبارکہ کی روشنی میں اپنا تعلیمی نظریہ پیش کیا جس کی افادیت پر آج ۱۲۰۰ سال بعد جدید دور کے ماہرین تعلیم حقیق نظر آتے ہیں۔

تعلیم کا مفہوم: لفظ ”تعلیم“ علم سے ماخوذ ہے۔ تعلیم کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کے بارے میں بار بار اور کثرت سے خبر دینا تاکہ سننے والے کے ذہن میں وہ بات پوری طرح بیٹھ جائے۔ یعنی طالب علموں کو ایسی تعلیم

دی جائے کہ ان کی جملہ صلاحیتوں کی مناسب نشوونما ہو سکے۔ چونکہ تعلیم کا انحصار فرد کے فلسفہ حیات پر ہوتا ہے اسی لیے ہر مفکر نے تعلیم کی تعریف اپنے اپنے نقطہ نظر سے کی ہے۔ ان میں چند کو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

امام الحرمینؒ اور ابن العربیؒ ماکلی: امام الحرمینؒ اور ابن العربیؒ ماکلی کے ہاں تعریفِ علم میں توقف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کی جامع اور مانع تعریف محض مشکل ہے۔ یہی رائے امام غزالیؒ کی بھی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ علم، جہل کی ضد ہے اور اعلیٰ الہدایات سے ہے اور اعلیٰ الہدایات کی تعریف نہیں ہوتی۔

ماتریدیہ کے نزدیک: ”صفة مودعة في القلب كالقوة الباصرة في العين“ کا نام علم ہے، یعنی آنکھ کی روشنی کی طرح دلی روشنی کا نام علم ہے۔

فلاسفہ کے نزدیک: ”حصول صورة الشيء بالصورة الحاصلة من الشيء عند العقل“ کا نام علم ہے، کیونکہ اُن کے ہاں علم کا تعلق صرف موجودات سے ہے۔ جب کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے ہاں علم کا تعلق موجودات اور معدومات دونوں کے ساتھ ہے۔

امام غزالیؒ کے نزدیک: تعلیم و تربیت کے تذکرے میں امام غزالیؒ کا نام صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ امام صاحب ایک ماہر تعلیم ہی نہیں بلکہ ماہر نفسیات بھی تھے۔ آپؒ کے خیال میں تعلیم اسلامی معاشرے کے بالغ ارکان کی جدوجہد ہے۔ جس سے آنے والی نسلوں کی نشوونما اور تفکیک زندگی اُن کے نصب العین کے مطابق ہوتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک: یونانی فلاسفہ اور افلاطون (Plato) کے نزدیک تعلیم ”حقیقت کی تلاش“ ہے، جو نیک کی طرف انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ مثالی معاشرے اور مملکت کی تعمیر کا واحد ذریعہ تعلیم ہی ہے۔

پستالوزی کے نزدیک: ماہر نفسیات پستالوزی (Pestalozzi) کے نزدیک تعلیم فرد کی جسمانی، اخلاقی اور ذہنی قوتوں کی متوازن نشوونما کا نام ہے۔

ڈاکٹر جان ڈیوی کے نزدیک: مشہور و معروف فلسفی اور ماہر ڈاکٹر جان ڈیوی (John Dewey) نے تعلیم کی تعریف اس طرح کی ہے۔ ”تعلیم بچے کے تجربات کی تعمیر نو، تجدید نو اور عظیم نو کا نام ہے۔“

ارسطو کے نزدیک: ارسطو کے نزدیک تعلیم کا مفہوم ایک نئے آدمی کی تعمیر ہے۔ تعلیم وہ عمل ہے جس سے معاشرے میں اتحاد اور عمدہ اخلاق پیدا کیے جاتے ہیں۔

روسو کے نزدیک: فرانسیسی مفکر ”روسو“ کے مطابق تعلیم فطری ماحول میں فرد کی انفرادیت کی نشوونما کا نام ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک تعلیم معاشرے کے پسندیدہ رسم و رواج، اقدار اور طرزِ حیات کو آئندہ نسل تک پہنچانے کا نام ہے۔ اور کچھ کے نزدیک تعلیم کا مطلب ترقی پذیر اور بدلنا ہوا معاشرہ پیدا کرنا ہے اور مزید کچھ ماہرین ان دونوں مغایم کو ملا کر ایک مجموعی تعریف کرتے ہیں۔ جس کے مطابق تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے

جس سے معاشرہ کی بقا اور ارتقا دونوں مقصود ہیں۔

تعلیم کا اسلامی مفہوم: تعلیم کی اہمیت پر جتنا زور اسلام نے دیا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم ہی وہ جوہر ہے جو انسان اور حیوان میں امتیاز کا باعث ہے۔ تعلیم انسان پر ایسے اثرات اور نقوش چھوڑتی ہے، جو کبھی مٹ نہیں سکتے۔ تعلیم ہی انسانی شخصیت کو جان بخشی ہے اور فرد کو اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

قرآن کریم میں خداوند کریم کا ارشاد ہے ﴿وَدَفَعَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ یعنی جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اللہ ان کے درجے بلند کرے گا۔ اس آیت ربانی سے علم کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسان کو عظمت و بزرگی تعلیم ہی سے حاصل ہوتی ہے اور جس کو اللہ کی طرف سے عظمت و بزرگی مل جائے، اسے کسی اور شے کی خواہش نہیں رہتی۔ قرآن کریم میں تعلیم کی اہمیت اور عظمت کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ حصول علم کو نیکی کے مترادف مانا گیا ہے جس سے انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا درجہ ملتا ہے۔

اسلام میں تعلیم نہ صرف روحانی ہالیدیگی اور اخلاقی نشوونما کو فروغ دیتی ہے بلکہ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے جس کا طالب علم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ تصورات، تہذیب و تمدن اور ثقافت بھی اس کے زیر اثر فروغ پاتی ہیں۔

اسلام کے نظریہ تعلیم کے مطالعے سے مندرجہ ذیل اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

ا: خداوند کریم نے انسان کو بے داغ فطرت اور لاحدود صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان صلاحیتوں کو ترقی دینا اس کی اپنی پسند، ہمت اور استعداد پر منحصر ہے۔

ب: خدا داد صلاحیتوں کو ترقی دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ انسان نظام کائنات کی تخلیق اور اس کے انداز کار پر غور کرے۔

ج: تعلیم کے متحرک تصور کے لیے کوئی مقررہ نصاب مثالی اور ابدی نہیں ہو سکتا، نصاب میں چلک اور قوت جذب ہونی چاہیے۔

د: تمام انسان آپس میں بھائی ہیں، ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں، اگر فوقیت ہے تو علم سے ہے۔ اسلام نے دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے علوم کو ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ اگر دینی اور دنیاوی علوم میں باہمی ربط و توازن ہوگا تو اسلامی نظریہ تعلیم کا عروج ہوگا۔

خود امام بخاریؒ کے نزدیک وہ علم معتبر ہے جس سے ایمان میں ترقی ہو، چاہے وہ حیات انسانی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہو بشرطیکہ شریعت سے متصادم نہ ہو۔

اسلام دینِ فطرت ہے، اس لیے وہ بلا امتیاز تعلیم کے حق کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ یہ انسان کا فطری تقاضا ہے۔ جس میں رنگ و نسل، امیر و غریب، عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جب کہ تعلیم اس کا لازمی جزو ہے، جس کے بغیر دین کی حیثیت کو سمجھنا ناممکن ہے۔

تعلیم کی فضیلت: اگر استاد اور طالب علم کے ذہن میں تعلیم کی عظمت نہ ہو تو دونوں کا اس میدان میں چلنا نہایت مشکل ہے۔ اس میں دراصل طالب علم اور استاد دونوں کو جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے اندر علم کے حصول کا ایک جذبہ ہو۔ تو استاد اور شاگرد کے ذہن میں علم کی فضیلت بٹھانے کے لیے امام بخاریؒ نے ﴿باب العلم قبل القول والعمل﴾ کے عنوان سے باب قائم کیا جس کے تحت ۱۲ کھتے ذکر فرما رہے ہیں۔

۱: ایمان اس وقت لاؤ گے جب علم ہو، مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو کسی چیز کے بارے میں علم ہو تو ایمان لاؤ گے۔ اگر ایک طرف ﴿وانما اعلمکم باللہ﴾ میں یہ بیان ہوا کہ علم وہ قابل قبول ہے جو ایمان کا نتیجہ ہو تو دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ علم کے لیے ایمان موقوف علیہ ہے۔

۲: علم سب وراثت نبوی ﷺ ہے۔ علم سے بنیادی طور پر مراد اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا ادراک کرنا ہے۔ قرآن وحدیث کے پڑھنے سے مرضیات ربانی کا ادراک ہوگا۔ معرفت ربانی جیسے بھی حاصل ہو، بغیر ﷺ کا وارث کہلائے گا۔

۳: علم ذریعہ دخول جنت ہے۔ چونکہ صاحب علم اللہ تعالیٰ کی مرضیات جانتا ہے، اسی وجہ سے اسی کے مطابق اپنی زندگی بنا کر جنت میں داخل ہوگا۔

۴: علم ذریعہ شہید الہی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿انما یحشی اللہ من عبادہ العلماء﴾ لہذا مرضیات ربانی کے جاننے کی وجہ سے صاحب علم اپنے آپ کو ان امور کے ارتکاب سے بچائے گا جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہو۔

۵: علم عقل مندی کی نشانی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وما یعقلہا الا العالمون﴾

۶: علم جہنم سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر﴾

۷: علم کے کوئی چیز مساوی نہیں۔ ﴿هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾

۸: علم اللہ کے ارادہ خیر کی نشانی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿من یرد اللہ بہ سعیرا ینفقہ فی الدین﴾

۹: علم کے لیے استاد کا ہونا ضروری ہے۔ ﴿وانما العلم بالتعلم﴾

۱۰: علم زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے جیسے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا ﴿لو وضعتم لصمعة علیٰ ہذہ ولنزل لی قلہ﴾

۱۱: علم ذریعہ تبلیغ ہے ﴿یلینغ الشاهد الغائب﴾

۱۲: علم سے حکمت سیکھی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿کونوا رہانین﴾ اسی حکماء علماء

فقہاء۔ اسی وجہ سے امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ علم حکمت اور ثقافت کا مجموعہ ہے۔

امام بخاریؒ کے ان ۱۲ اکتوں سے واضح ہو رہا ہے کہ استاد کو اپنے پیٹھے اور منصب سے وقادار ہونا چاہیے۔

تعلیم کی ضرورت: ابتدائی دور میں انسان تمہارہ رہتا تھا۔ تمہارہ کردہ ماحول کو قابو میں نہ لاسکتا تھا۔

ماحول کی مخالف قوتیں بڑی زور آور اور خاتم تھیں۔ اس کی مخالفت سے بچنے کے لیے تمہارا انسان کافی نہ تھا۔ فطرت

نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ علیحدہ زندگی گزارنے والے انسان اگر یکجا ہو جائیں تو وہ با آسانی ان مخالف قوتوں

پر قابو پاسکتے ہیں۔ اس ضرورت کے تحت بے ترتیب اور غیر منظم انسان ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ اس

قریب نے باہمی تعلقات، تنظیم، نظم و ضبط اور ایسے دیگر کئی مسائل پیدا کر دیے جس کی وجہ سے انسان خیالات،

افکار، نظریات اور ابلاغ و اظہار میں ہم آہنگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے

انہوں نے مختلف طریقے، اشیاء، مہارتیں، معلومات، قاعدے، قوانین اور رہن مہن کے انداز اختیار کیے۔ ان کے

صحیح اور بُر اثر استعمال کی دیکھ بھال کے لیے ادارے قائم کیے اور یوں ایک ثقافت وجود میں آئی۔ ہر نسل اسی

ثقافت کو بہتر صورت میں نئی نسل تک منتقل کرتی رہی۔ یہ انتقال ثقافت کے ذریعے ہی ممکن ہوا۔ لہذا انسان نے

اپنے معاشرے کی ثقافت کو منتقل کرنے کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جو تعلیم کا فریضہ ادا کر سکیں۔ اس ادارے کی

ابتدا گھر سے ہوئی جہاں ماں باپ کی حیثیت معلم کی تھی۔ لیکن معاشرتی وحیدگی نے انسان کو نئے ادارے قائم

کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح تعلیم کے ہا قاعدہ رکھی ادارے قائم ہو گئے اور تعلیم ایک معاشرتی ذمہ داری بن گئی۔

تعلیم کا مقصد: حقیقت یہ ہے کہ مقاصد تعلیم قوم کے نقطہ حیات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا ایک

فلسفہ حیات ہوتا ہے، کیونکہ تعلیم ہی وہ ذریعہ یا آلہ ہے جس کے ذریعے قوم اپنی نئی نسل کو اپنے فلسفہ حیات سے

روشناس کراتی اور انہیں ہا مقصد زندگی گزارنے کے اہل بناتی ہے۔ چنانچہ ہر مفکر نے تعلیم کے مقاصد متعین کرنے

کی کوشش کی ہے۔

سقراط کی رائے: سقراط کے خیال میں تعلیم کا مقصد نیک افراد پیدا کرنا ہے۔

افلاطون کی رائے: افلاطون کے نزدیک تعلیم کا اولین مقصد فرد اور معاشرہ میں توازن برقرار رکھنا ہے۔

ارسطو کی رائے: ارسطو کا کہنا ہے کہ تعلیم کا مقصد زندگی میں مسرت و شادمانی حاصل کرنا ہے، جس کے لیے

ضروری ہے کہ ہر فرد کو اس کے حقوق و فرائض سے آگاہ کر دیا جائے۔

امام غزالیؒ کی رائے: امام غزالیؒ کے خیال میں تعلیم کا مقصد سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کرنا ہے۔

تخصر: ایہ کہ تعلیم کے مقاصد زمانے اور وقت کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم کا مقصد: قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم کا مقصد انسان کو انسانیت کی اعلیٰ صفات سے متصف کرنا ہے۔ اس میں حق پرستی، انصاف پسندی، مساوات کا جذبہ، بہادری، بے خوفی، محبت الہی، عبادت کا شوق، نیکی کا تاثر قبول کرنے کی اہلیت اور عام زندگی کی صلاحیتوں کو فروغ دینا ہے۔ تعلیم کا مقصد اس کے ذہن کو اس طرح جلا بخشنا ہے کہ وہ ظلم اور زیادتی، بے انصافی اور عدم مساوات، استحصال اور جبر سے فطری طور پر نفرت کر سکے اور معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کو سب سے بڑی سعادت خیال کرے۔

تعلیم و تدریس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن سچائیوں کا درس ہم اپنی نوخیز نسل کو دینا چاہتے ہیں، بڑی نسل اس کی عملی تصویر ہو اور سچائیوں پر کاربند ہو۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو نظریات اساتذہ کی محض زہالوں پر رہیں اور بالغ مردوں اور عورتوں کے کردار ان کی حقیقی عکاسی نہ کر سکیں، وہ نئی نسل کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، خواہ ان کی تدریس صبح سے شام تک جاری رہے۔ ہمارا کردار ہمارے اصولوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ قول اور فعل کا تضاد نئی نسل کی ذہنی و جذباتی صحت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔

مندرجہ بالا ابحاث کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے قدیم اور جدید نظریات کو سمجھا جائے۔ اگرچہ کوئی حد فاصل مقرر نہیں کی جاسکتی کہ قدیم نظریہ کس دور اور عہد تک مقبول رہا ہے اور جدید مفہوم کب رائج ہوا۔ آج بھی بہت سے معاشرے قدیم نظریہ تعلیم کو درست سمجھتے ہیں اور کئی قدیم ماہرین اور معاشرے بھی آج کے ترقی یافتہ نظریہ تعلیم کے قریب تر تھے۔

قدیم نظریہ تعلیم: قدیم نظریہ تعلیم میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ طالب علموں کی ضروریات اور احساسات کی بجائے استاد کے نظریات کو اولیت حاصل تھی۔ تعلیمی اداروں میں ڈیپٹن سخت تھا۔ زیادہ سے زیادہ اخلاقی تربیت پر زور دیا جاتا تھا۔ نصاب تعلیم بچوں کی ضروریات کی بجائے استاد کی تجویز کی ہوئی کتب پر مشتمل ہوتا تھا۔ طالب علموں کو جن مضامین کا درس دیا جاتا تھا وہ ان کے نفسیاتی تقاضوں، عمر اور استعداد سے عموماً بے تعلق ہوتا تھا۔ سارا زور ذہنی ہالیدی پر ہوتا تھا۔ کسی مضمون کو یاد کر کے اس پر عبور حاصل کرنا تعلیم کہلاتا تھا۔ بچے کو ایک ہی وقت میں کئی کئی ایسے مضامین کا مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا جن کا ان کی زندگی یا قریبی ماحول سے واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ تعلیم دینے کا کام زیادہ تر مذہبی لوگ سرانجام دیتے تھے اور یہ تعلیم صرف امراء کے بچوں کے لیے مخصوص ہوتی تھی، باقی عوام اور خصوصاً عورتیں تعلیم سے محروم رہتی تھیں۔ بچے کی قابلیت کا معیار اس کی یادداشت اور قوت حافظہ پر ہوتا تھا۔

قدیم نظام تعلیم میں طریقہ تدریس: قدیم نظام تعلیم میں طرق تدریس بھی ناقص تھے۔ استاد کا کام درس دینا اور شاگرد کا کام درس سننا ہوتا تھا۔ معلم ہی ہر چیز میں پیش پیش ہوتا تھا، یعنی تعلیم، نظام تعلیم، نصاب اور فلسفہ سب کچھ معلم ہی ہوتا تھا۔ معلم اپنے اسباق میں امدادی اشیا کا استعمال نہ کرتا تھا، صرف زبانی درس پر زور ہوتا تھا۔ بچوں کی دل چسپیوں یا ان کے احساسات اور جذبات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اساتذہ کی تربیت کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ جو کوئی دوسرا کام نہ کر سکتا تھا، وہ عام طور پر معلمی کا پیشہ اختیار کر لیتا تھا۔

معلم کی تربیت: امام بخاریؒ معلم کی تربیت کے واسطے دو باب ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ﴿باب قول اللہ تعالیٰ وما اوتیتہم من العلم الا قلیلاً﴾ یعنی استاد کو چاہیے کہ اپنا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں معمولی سمجھے، اگر کسی کا احساس ہو تو سیکھنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اسی طرح ﴿باب ما یستحب للعالم اذا سئل انی الناس اعلم فینکل العلم الی اللہ تعالیٰ﴾ سے بتلانا چاہتے ہیں کہ بہترین استاد کی خوبی یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ اللہ کی ذات کو سمجھے اور اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ اسی طرح استاد اور شاگرد دونوں کے درمیان قرب آجائے گا تو دونوں کو فائدہ ہوگا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ استاد کو جو مسئلہ نہیں آتا، وہ غلط نہیں بتائے گا بلکہ پوچھے گا، مطالعہ کرے گا۔ یہ بہترین استاد کی ایک اضافی خوبی ہے۔

معلم کی ذمہ داریاں: تعلیم و تدریس ایک ایسا شعبہ ہے جس میں معلم نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ اس کی کارکردگی پر اس کے طالب علموں کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے، طلبہ کی فطرت کو تبدیل کر سکتا ہے اور انہیں اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ معلم کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کے ساتھ ہمیشہ صاف ستھرا، باوقار اور شائستہ لباس پہننے کا عادی ہونا چاہیے۔ چونکہ معلم کی عادات و اطوار پر طلبہ کی خاص نظر رہتی ہے، وہ ان کے انداز و بیان، طرز کلام، چال چلن، انداز و نشست و برخاست پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ اس لیے معلمین حضرات اپنے اندر ایسی عادات و اطوار پیدا کریں جو دوسروں کے لیے باعث تقلید ہوں اور انہیں تسخیر کا نشانہ نہ بنایا جاسکے۔ چونکہ تعلیم کے میدان میں معلم کو ایک ماہر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اپنے اس اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کے لیے ایک اچھے معلم پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

۱: استاد کے لیے پڑھاتے وقت ضروری ہے کہ خود بھی نشاط میں ہو اور اس کے ساتھ ساتھ معلم کی نشاط کا بھی خیال رکھے اور اسے چاہیے کہ ایسے اوقات میں پڑھائے کہ پڑھنے کے لیے دل میں شوق اور نشاط ہو اور تنفر اور اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ﴿باب ما کان النبی ﷺ یتعولہم بالموعظۃ والعلم کی لا ینفروا﴾

۲: معلم کو چاہیے کہ دوران تدریس کسی شاگرد کے غیر متعلقہ سوال سے جواب آخر میں دے تاکہ دوران

سبق غیر متعلقہ باتوں سے درس میں خلل واقع نہ ہو اور ذہن منتشر ہو کر اصل مقصود نوت نہ ہو جائے۔

اسی طرح اگر سوال مناسب بھی ہو لیکن معلم جواب کو مؤخر کر کے درس کے آخر میں جواب دے، تو یہ بھی جائز ہے۔ اسکی طرف اشارہ امام بخاریؒ کی پیش کردہ حدیث سے ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مجلس میں ہاتس کر رہے تھے، اسی دوران ایک اعرابی صحابی نے قیامت کے وقوع کے متعلق سوال کیا، آپ ﷺ نے فارغ ہو کر جواب دیا۔

۳: اچھے مدرس کی خوبی یہ ہے کہ اس کا درس طلباء کے تینوں طبقوں یعنی فنی، متوسط اور ذہین کے معیار کے مطابق ہو، تاکہ کسی ایک طبقے کے طالب علم کو سمجھنے میں دقت نہ ہو اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے ﴿باب الفہم فی العلم﴾ کے عنوان سے ترجمہ الباب قائم کر کے واضح کیا کہ لوگ فہم فی العلم میں مختلف ہوتے ہیں لہذا استاد کو سب کی رعایت کرنی چاہیے۔

۴: دورانِ درس اگر طالب علم کوئی ایسا سوال کر لے جو استاد کو برا لگے تو استاد اسے ڈانٹنے کی بجائے تحمل سے کام لے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرے اور اس کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرے جیسے کہ اس اعرابی صحابی کے غیر متعلقہ سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے عملی طور پر نرمی کے برتاؤ کا ثبوت دے دیا۔

۵: سوال و جواب کے دوران استاد مسئلہ مسئلہ کے علاوہ اس کے مناسب اور مسائل بھی بیان کرے تاکہ طالب علم تشویش کا شکار نہ ہو جیسے کہ نبی کریم ﷺ سے سمندر کے پانی سے وضو کرنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا ﴿هو الطہور ماء والحل مبتہ﴾

۶: معلم کے شاگرد اتنے ہونے چاہیے کہ وہ آسانی سے معلم کی آوازیں سکیں اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے ﴿باب من رفع صوتہ بالعلم﴾ کے عنوان سے ترجمہ الباب قائم کیا۔ تعلیمی سوچ کے مطابق یہ بات وسائل پر مبنی ہے کہ زیادہ طلبہ کی ہنسٹ کم طلبہ کی تربیت آسان ہوتی ہے۔ اگر ایک جماعت میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہو تو آواز پہنچانے کے لیے معلم لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا استعمال کر سکتا ہے تاہم کلاس اور جماعت پر دسترس حاصل کرنا معلم کے لیے ایک ضروری امر ہے۔

۷: مدرس کو طالب علم کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہیے، یعنی اس کے درس میں جلال کی بجائے جمال ہونا چاہئے تاکہ طالب علم سوال پوچھنے میں حرج محسوس نہ کرے جیسے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب طالب علم تمہارے پاس آئے تو ﴿فقولوا لہم مرحبا﴾

۸: معلم تعلیم کے لیے ایام کی تخصیص کر سکتا ہے، ایسا کرنا بدعت کے قبیل سے نہیں ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے باب قائم کیا ﴿باب من جعل لاہل العلم اياما معلومة﴾ (بقیہ صفحہ ۳۷ پر)